گیان چند

"......... میں اصولاً ادھار نہیں لیتا۔ دکاندار سے سامان لینے جاؤں گا اگر اتفاق سے جیب میں پیسے کم ہوئے تو گھر واپس آ کر لے جاؤں گا اور تبھی مزید خریدوں گا۔ میں نے مکان بنایا، موٹر خریدی ...... لیکن کبھی قرض نہیں لیا ...."

مولد و خاندان: میرا وطن قصبہ سیوہارا ضلع بجنور یو پی ہے۔ مذہب جین اور ذات اگروال ہے۔ سوداؔ کی ایک ہجو کا پہلا مصرع ہے ع ایک تھا بنیا ساہوکار، نام تھا اس کا گیان چند۔ اس مصرع کا مجھ پر پورا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ میں بھی قوم کا بنیا ہوں۔ میرا شجرہ یوں ہے۔ گیان چند بن بجال سنگھ بن بہاری لال بن پدم سین بن موہن لال بن منگنی رام بن سیتارام۔ اس سے اوپر کے نام معلوم نہیں۔ منگنی رام دھام پور سے سیوہارہ منتقل ہوئے تھے۔ باپ اور دادا اُردو سے نابلد تھے لیکن پردادا حکیم پدم سین فارسی کے عالم تھے۔ سنا ہے کہ وہ شعر بھی کہتے تھے اور زیرک تخلص کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کئی فارسی مخطوطات گھر میں محفوظ تھے۔ والدہ کا نام پاروتی تھا اور وہ غیر جین سناتنی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ میرے والدین کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی ایک سال سے کم کی عمر میں گزر گئے اس لئے ہمارے شعور میں ہم تین بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ ایک بہن اور ایک بھائی کا کینسر سے انتقال ہو گیا ہے۔ میری جنم پتری کھو گئی ہے لیکن میری یادداشت اور روایات کے مطابق میری تاریخ ولادت ۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء ہے۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب میں نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔

تعلیم۔ میں نے مسلم قدرت اسکول سیوہارہ سے ۱۹۳۷ء میں آٹھواں درجہ پاس کیا۔ اس زمانے میں سیوہارے میں مڈل اسکول ہی تھا۔ پارکر ہائی اسکول مرادآباد سے ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اردو اور ریاضی میں امتیاز کے ساتھ فرسٹ ڈویژن ملا۔ اسکول میں اُردو، فارسی کے اُستاد مولوی ظفر حسین عاصی تھے۔ امروہے کے رہنے والے تھے اور بڑے عالم تھے۔ گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد سے سیکنڈ ڈویژن میں ۱۹۴۱ء میں انٹر کیا۔ مضامین تھے اُردو، فارسی، انگریزی منطق۔ اُردو کے استاد کوئی فاروقی صاحب تھے جن کا پورا نام یاد نہیں رہا۔ فارسی کے استاد مولوی فدا علی یا فدا حسین تھے اور ان کے بعد سید لقا علی نے پڑھایا۔ ڈگری تعلیم کے لئے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جنرل انگلش یا انگریزی ادب، اُردو اور سیاسیات کے مضامین لیے۔ بی اے ۱۹۴۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں کیا۔ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر حفیظ سید اور سید اعجاز حسین تھے۔ ایم اے اردو ۱۹۴۵ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن میں کیا۔ ایم اے کے اساتذہ میں پروفیسر سید ضامن علی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور ڈاکٹر سید رفیق حسین تھے۔

ایم اے میں میرے ہم جماعتوں میں سید مجتبیٰ حسین بھی تھے۔ بڑے قابل تھے۔ اب وہ کراچی میں پڑھاتے ہیں اور ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ایم اے کے دوران انھوں نے مجھے ریسرچ کا موضوع سمجھایا: اردو داستانیں۔ چنانچہ ایم اے کرنے کے بعد میں نے اسی موضوع پر ضامن صاحب کی نگرانی میں ڈی فل میں داخلہ لیا۔ میں نے جون ۱۹۴۷ء میں اپنا مقالہ داخل کر دیا۔ ممتحنین تھے پروفیسر ضامن علی، مرزا جعفر علی خاں اثر اور ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈھاکے والے۔ چونکہ ڈھاکہ پاکستان میں چلا گیا اس لئے وہاں سے رپورٹ آنے میں بہت دیر لگی۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں میری ڈی فل کا اعلان

کا اعلان ہوا۔ میرا خیال ہے کہ میں ملک میں اُردو کا آٹھواں پی ایچ ڈی یا ڈی فِل تھا۔ میرے اساتذہ میں ڈاکٹر رفیق حسین ملک کے پہلے اردو ڈی فل اور ڈاکٹر اعجاز حسین پہلے ڈی لٹ تھے۔ ۱۹۵۴ء میں میں نے آگرہ یونیورسٹی سے سوشالوجی میں ایم اے کیا جس میں سیکنڈ ڈویژن ملی۔ یہ ایم اے میں نے پرائیویٹ طور پر کیا۔

غالباً ۵۶ء میں میں نے آگرہ یونیورسٹی ہی میں ڈی لٹ کے لئے داخلہ لیا۔ جس زمانے میں میں نثری داستانوں پر کام کر رہا تھا مجھے محسوس ہوا تھا کہ منظوم داستانوں یعنی مثنویوں پر بھی کام ہونا چاہیئے۔ مجھ سے ایک سال بعد ایک طالب علم ملنح ناتھ ورما نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں ریسرچ میں داخلہ لیا اور میری تجویز پر اردو مثنویوں کا موضوع لیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین ان کے نگراں تھے۔ ورما صاحب ایک سال بعد ریسرچ کو تیاگ کر چلے گئے۔ میں نے ڈی لٹ کے لئے دہی شمالی ہند میں اُردو مثنوی کا موضوع لیا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ الٰہ آباد میں سیّد محمد عقیل اسی موضوع پر ڈاکٹر اعجاز حسین کی نگرانی میں ڈی فل کے لئے کام کر رہے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ انھیں ڈی فل کی ڈگری مل گئی ہے۔ میں نے کسی ذریعے سے ان کا مقالہ منگا کر دیکھا۔ اندازہ ہوا کہ ان کا کام تنقیدی نوعیت کا ہے میں تحقیقی پہلو پر زور دینا چاہتا تھا اس لئے میں نے اپنا کام جاری رکھا اور ۵۸ء میں مقالہ یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ ممتحنین تھے پروفیسر عبدالقادر سروری (عثمانیہ یونیورسٹی)، پروفیسر آل احمد سرور (علی گڑھ) اور جناب کلیم الدین احمد۔ پہلے دو حضرات نے مقالے کو پاس کر دیا۔ اور کلیم صاحب نے نظرِ ثانی کے لئے واپس کرنے کی سفارش کی۔ ان کے بعد مقالہ چوتھے ممتحن ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی (بمبئی) کے پاس بھیجا گیا۔ انھوں نے بھی مقالے کو ترمیم کے لئے واپس کرنے کی سفارش کی۔ نتیجۃً مقالہ مجھے واپس کر دیا گیا۔ کلیم صاحب کی رپورٹ بہت مفصّل تھی۔ میں ان کے کئی اعتراضات کو تسلیم نہیں کرتا لیکن بقیہ کو قبول کرتا ہوں۔ ان کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اس مقالے میں مثنوی کی تاریخ ہے، ارتقا نہیں۔ میں اس اعتراض کو پوری طرح نہیں سمجھا لیکن اگلی بار میں نے ایک باب اردو مثنوی کا ارتقاء کے عنوان سے اضافہ کیا جس میں مثنوی میں رجحانات کے ارتقاء کا دھانچہ پیش کیا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کو کس لئے ڈی لٹ کا ممتحن بنایا گیا وہ ایک کالج کے استاد تھے اور خود ڈی لٹ بھی نہیں تھے۔ ان کا اعتراض تھا کہ سیاسی اور سماجی پس منظر کا باب بہت مختصر ہے اگلی بار میں نے یہ بات بہت مفصّل لکھ دیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے میری کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اسی باب کے طول پر اعتراض کیا ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جب میں جموں یونیورسٹی میں پروفیسر تھا ایک بار غلطی سے ریڈر کی پوسٹ کا اشتہار ہو گیا۔ ڈاکٹر مدنی نے بھی درخواست دی اور ایک ذاتی خط میں مجھے لکھا کہ اگر آپ مجھے اس پوسٹ کا اہل سمجھتے ہوں تو لے لیجئے۔

اگر مقالہ ترمیم کے لئے واپس کیا جاتا ہے تو کم از کم چھ ماہ کے بعد دوبارہ داخل کیا جا سکتا ہے۔ آگرہ یونیورسٹی میں قاعدہ تھا کہ ڈی لٹ کا رجسٹریشن کرایا جائے تو جلد از جلد چھ ماہ کے بعد ہی مقالہ داخل کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنا پہلا رجسٹریشن منسوخ کرایا اور دوسری بار عنوان کی خفیف سی تبدیلی کے بعد نیا رجسٹریشن کرایا۔ کچھ عرصے کے بعد مقالہ داخل کر دیا۔ ممتحنین تھے پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور اور سید احتشام حسین۔ مقالہ پاس ہو گیا اور ۱۹۶۰ء کے اوائل میں مجھے ڈگری مل گئی۔ اس طرح کاغذی قواعد کے لحاظ سے میری یہ ڈی لٹ کی ڈگری پہلی کوشش ہی پر ملی ہے اور مقالہ ترمیم کے لئے واپس نہیں کیا گیا لیکن

حقیقت یہی ہے کہ یہ ترمیم شدہ مقالہ ہے۔ نقشِ ثانی میں نقشِ اوّل سے صرف یہ فرق ہے کہ سیاسی اور سماجی پس منظر کا باب زیادہ مفصّل ہے اور چوتھا باب "اردو مثنوی کا ارتقا" نیا اضافہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ مقالہ اسی شکل میں ہے جیسا کہ پہلی بار تھا۔ ڈی لٹ کے دوسرے مقالوں کو سامنے رکھ کر آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس مقالے کا نقشِ اوّل ڈی لٹ کے شایانِ شان تھا کہ نہیں۔ میں نے ۱۹۶۱ء میں ساگر یونیورسٹی کے گرمائی اسکول لسانیات میں درس لیا اور ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ کے اسکول میں شامل ہو کر ایڈوانس لسانیات کا سرٹیفکیٹ لیا۔

تاہل - ۱۹۵۳ء میں سہارنپور میں شادی کی۔ اہلیہ کا نام اُرملا ہے۔ اور یہ بھی خیر جین سناتن دھرمی خاندان کی ہیں۔ شادی کے سال انھوں نے ہندی میں ایم اے پرِیولیس کیا تھا۔ بعد میں ایم اے فائنل کر کے تکمیل کر لی۔ اولاد میں ایک لڑکی اور دو لڑکے ہیں۔ لڑکی کی شادی ہو گئی اور وہ امریکہ میں رہتی ہے۔ بڑے لڑکے نے تعلیم مکمل کر لی ہے اور وقتِ تحریر وہ ملازمت کی تلاش میں ہے۔ چھوٹا لڑکا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

ملازمت : ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد میں تین سال بے روزگار رہا۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں اُردو کا لکچرر ہوا۔ یہ ایک سرکاری ڈگری کالج تھا۔ میرا گریڈ ۲۰۰ تا ۵۰۰ تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ترقی پا کر ۳۰۰ تا ۷۰۰ کے گریڈ میں ہو گیا۔ ۱۹۵۷ء میں حمیدیہ کالج میں اُردو ایم اے کا کلاس کھولا گیا اور میں کالج پروفیسر مقرر ہوا۔ اسی سال وکرم یونیورسٹی اجین قائم ہوئی اور حمیدیہ کالج اسی سے ملحق ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء میں مجھے ترقی دے کر گورنمنٹ ڈگری کالج سیہور کا پرنسپل مقرر کیا گیا لیکن میں نے یہ ترقی نہیں لی۔ اور پروفیسر کی پوسٹ پر رہا حالانکہ اس سے میرا مالی خسارہ ہوا۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں میں جموں کشمیر یونیورسٹی کے جموں ڈویژن میں پروفیسر اُردو مقرر ہوا۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں میں نے وہاں چارج لیا۔ اور نیا شعبہ قائم کیا۔ ۱۹۶۹ء میں جموں یونیورسٹی کشمیر یونیورسٹی سے الگ ہو گئی۔ جموں میں گیارہ سال کی ملازمت کے بعد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبہ ہو کر واپس آ گیا۔ اگست ۱۹۷۸ء میں یہاں کے وائس چانسلر نے مجھے الہ آباد یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری پیش کی۔ میں نے معذرت کر لی۔ چند روز کے بعد پھر انھوں نے کسی کو میرے پاس بھیجا جس نے مجھے رضامند کرنا چاہا لیکن میں نہ مانا۔ دسمبر ۱۹۷۸ء میں حیدرآباد کی نئی مرکزی یونیورسٹی نے مجھے اُردو پروفیسری کی پیش کش کی۔ میں انکار کرتا رہا۔ میرے دوستوں نے اصرار کیا اور مجھے مجبور کیا کہ میں اس اسامی کو قبول کر لوں۔ آخر فروری ۱۹۷۹ء کے وسط میں میں نے اپنی عارضی منظوری دے دی ہے اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء کو (بشرطِ حیات) وہاں کا چارج لوں گا۔ اپریل میں وہاں دیکھ کر طے کروں گا کہ مجھے وہاں رہنا چاہیے یا الہ آباد واپس آ جانا چاہیے۔

تصانیف : میری ذیل کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) اُردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان کراچی ۱۹۵۴ء۔ میں اس کتاب سے بہت ناآسودہ تھا۔ اس کو میں نے ازسرِ نو لکھا اور بہت سے اضافے کئے۔ طبع دوم یعنی ترتیبِ نو انجمن ترقی اُردو پاکستان سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اب اس پر مزید نظرِ ثانی کی ہے اور اسے شائع کرانے کی فکر میں ہوں۔

(۲) تحریریں: تنقیدی و تحقیقی اور چند انشائی مضامین کا مجموعہ۔ فروغِ اردو لکھنؤ ۱۹۶۱ء

(۳) اُردو مثنوی شمالی ہند میں۔ انجمن ترقیِ اردو ہند ۱۹۶۹ء۔ یہ ڈی لٹ کا مقالہ ہے۔ اس کا مسودہ میں نے انجمن کو ۱۹۶۱ء میں دے دیا تھا جہاں سے یہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

(۴) تفسیرِ غالب۔ جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی سری نگر۔ اس کتاب پر تاریخ اشاعت ۱۹۷۱ء درج ہے لیکن یہ دراصل مارچ اپریل ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے قلم زد کلام کی شرح ہے۔

(۵) لسانی مطالعے ۱۹۷۳ء۔ یہ لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جسے ترقی اردو بورڈ کے لئے نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا۔

(۶) تجزیے۔ ۱۹۷۵ء مکتبہ جامعہ نئی دلی۔ یہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۷) رموزِ غالب۔ ۱۹۷۶ء مکتبہ جامعہ نئی دلی۔ یہ غالب سے متعلق میرے مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۸) حقائق ۱۹۷۷ء۔ یہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جسے خود میں نے شائع کیا۔

زیرِ طبع۔

(۹) ذکر و فکر۔ یہ بھی تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کی کتابت ہو رہی ہے اور اسی سال میں ضرور شائع ہو جائے گا۔ اسے بھی میں ہی شائع کر رہا ہوں۔

(۱۰)۔ 'عام لسانیات'، یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو برسوں سے ترقی اُردو بورڈ میں زیرِ طبع ہے۔ چند ماہ میں 'اُردو مثنوی شمالی ہند میں' کا دوسرا ایڈیشن بھی آنے والا ہے۔

عہدِ زمانۂ طالب علمی میں کثرت سے شعر کہے جو شائع نہیں کئے۔ ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء کے بعد شاعری ترک کر دی۔ اس کے بعد پانسات غزلیں ہی کہی ہوں گی۔ جملہ اشعار تقریباً ساڑھے تین ہزار ہیں جن میں کوئی پانسو رباعیاں ہیں۔ کبھی فرصت ہو تو ان کا انتخاب کرکے اصلاح و ترمیم کروں اور پھر ایک مجموعہ ترتیب دوں۔

انعامات: میری کتابوں پر حسبِ ذیل انعامات ملے۔

۱۔ یوپی اردو اکیڈمی سے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' اور تفسیرِ غالب پر دو دو ہزار کے انعامات اور لسانی مطالعے پر تین ہزار کا انعام۔

۲۔ تفسیرِ غالب پر ایوانِ غالب کے غالب انسٹی ٹیوٹ سے پانچ ہزار کا انعام ملا۔

۳۔ تجزیے پر جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی سے دو ہزار کا انعام ملا۔

چونکہ میں خود یوپی اُردو اکیڈمی کی انعامی کمیٹی کا رکن ہو گیا اس لئے میری تازہ کتابوں کو انعام کے لئے داخل نہیں کیا جا سکا۔

کمیٹیوں کی رکنیت:

۱۔ انجمن ترقیِ اردو ہند کی جنرل کونسل کا آخری لائف ممبر۔

۲۔ بھارتیہ گیان پیٹھ کی اردو کمیٹی کا رکن۔

۳۔ ساہتیہ اکادمی کی اردو کمیٹی کا رکن۔

۴۔ یوپی ہندوستانی اکیڈمی کا وائس پریزیڈنٹ۔

۵۔ فروغ اُردو کی گجرال کمیٹی کا رکن رہ چکا ہوں۔

۶۔ ترقی اُردو بورڈ کا رکن۔

بعض دوسرے اداروں اور کمیٹیوں کا بھی رکن ہوں لیکن وہ قابلِ ذکر نہیں۔ دراصل اب میں کمیٹیوں کی رکنیت چھوڑتا جارہا ہوں کیونکہ سفر نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں تک گردش کیجئے اور کیوں کیجئے؟ حتی الامکان پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں نے قسم کھا کر امتحان کے پرچے بنانا اور کاپیاں دیکھنا ترک کر دیا ہے۔ تدریسی ملازمت میں جلبِ زر اور تجارت کے یہی دو ذریعے ہوتے ہیں۔ کمیٹیوں کی رکنیت اور امتحان کا کام۔ میں نے انھیں دونوں سے اجتناب کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے کچھ اور ریکارڈ ہیں۔

۱۔ آج تک میں نے کسی سے امتحانی کام کی درخواست نہیں کی۔

۲۔ میں نے کبھی کسی سے کسی کمیٹی کی رکنیت کی التجا نہیں کی۔

۳۔ میں نے کبھی کسی سے اپنی کسی کتاب یا تحریر پر تبصرہ کرنے کو نہیں کہا۔

۴۔ میں اصولاً اُدھار نہیں لیتا۔ دکاندار سے سامان لینے جاؤں گا، اگر اتفاق سے جیب میں پیسے کم ہوتے تو گھر واپس آکر لے جاؤں گا اور تبھی مزید خرید کروں گا۔ میں نے مکان بنایا، موٹر خریدی اور اس کے ایک ماہ بعد ہی ریفریجریٹر۔ کبھی قرض نہیں لیا۔

۵۔ کبھی کسی الیکشن میں کھڑا نہیں ہوا۔ تعلیمی زندگی میں بھی کسی بزم کے عہدے کے لئے الیکشن نہیں لڑا۔ انجمن ترقیِ اُردو کی مجلس عام کے لئے میرے علم کے بغیر میرا نام تجویز کیا گیا۔ ووٹ پڑے، میں منتخب ہوا اور اخبار سے مجھے معلوم ہوا کہ میں مجلسِ عام میں لے لیا گیا ہوں۔

مجھ اکھڑے ہوئے آدمی کی بے رنگ زندگی کی یہ بے کیف روداد ہے جسے ۱۸ مارچ ۱۹۷۹ء کو نذرِ قرطاس کیا۔
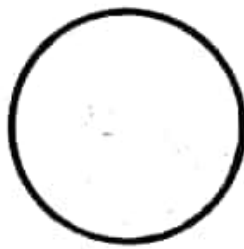
۞

SOLE DISTRIBUTORS

SAKAR PUBLISHERS PVT., LTD.

107-JOLLY BHAVAN NO. 1,
10 NEW MARINE LINES,
BOMBAY-400 020.

آپ بیتی نمبر
نگراں
کالیداس گپتا رضاؔ
مدیر
صابر دت